ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY



AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1958

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :قرآن اور مستشرقین • (1958) سطح :بی ایس علوم اسلامیہ) تخصص قرآن و تفسیر(

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 2 یونٹ 6 تا(9

کل نمبر • 100 :کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ کسی دوسرے طالب علم کی تحریر یا اس گائیڈ کی ہو بہو نقل کرنا تعلیمی بددیانتی ہے اور یونیورسٹی کی پالیسی کے مطابق کارروائی ہو سکتی ہے۔

سوال نمبر :1 مصحفِ ابنِ مسعود کے بارے میں جیفری کا نقطۂ نظر 20) نمبر(

سوال نمبر1 ۔ مصحفِ ابنِ مسعود کے بارے میں جیفری کا نقطہ نظر کیا ہے؟ نوٹ تحریر کیجئے۔(20)

تعارف

آرتھر جیفری1892) ء تا1959 ء (آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے مستشرق تھے جنہوں نے قاہرہ اور کولمبیا یونیورسٹی میں تدریس کی اور قرآن کے متن کی تاریخ پر خاص کام کیا۔ ان کی دو کتابیں اس موضوع میں مشہور ہیں :ایک قرآن کے غیر ملکی الفاظ پر اور دوسری مواد برائے تاریخِ متنِ قرآن، جو1937 ء میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب میں جیفری نے جمعِ

عثمانی سے پہلے کے ذاتی مصاحف کی روایات جمع کیں اور ان میں سب سے زیادہ تفصیل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف کو دی۔ اس سوال میں جیفری کے اسی نقطۂ نظر کا بیان اور اس کا علمی جائزہ مقصود ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی، اولین مسلمانوں میں سے اور قرآن کے بڑے قاری و معلم تھے۔ کوفہ میں ان کی قراءت و تعلیم مشہور تھی اور ان کے پاس اپنا ذاتی مصحف تھا۔ یاد رہے کہ ذاتی مصحف سے مراد وہ صحیفہ تھا جو ایک صحابی اپنے استعمال کے لیے رکھتا تھا اور اس میں بسا اوقات تفسیری نوٹ، دعائیں اور قراءت کی وضاحتیں بھی درج ہوتی تھیں۔ یہی پس منظر جیفری کے دعووں کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے ضروری ہے۔

جیفری کی کتاب اور اس کا طریقۂ کار

جیفری نے اپنی کتاب میں ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف اور دوسری قراءات و فضائل کی کتب سے وہ تمام روایات اکٹھی کیں جن میں صحابہ کے مصاحف کی قراءتوں کا ذکر تھا۔ اس نے ان قراءتوں کی ایک طویل فہرست بنائی اور ہر صحابی مصحف کو گویا ایک الگ متن کی حیثیت دے کر پیش کیا۔ اس کے نزدیک عثمانی مصحف کی اشاعت سے پہلے قرآن کے متعدد باہمی مختلف متون گردش میں تھے اور عثمانی عمل دراصل ان میں سے ایک متن کا انتخاب اور باقیوں کا خاتمہ تھا۔ اسی بنیاد پر اس نے ابن مسعود کے مصحف کو عثمانی متن کے مقابل ایک آزاد و مختلف مصحف کے طور پر پیش کیا۔

طریقۂ کار کے اعتبار سے جیفری کا انحصار تقریباً مکمل طور پر بعد کی صدیوں کی ادبی کتابوں میں منقول روایات پر تھا، نہ کہ کسی موجود مخطوطے پر، کیونکہ ابن مسعود کا کوئی مصحف آج دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس نے ان روایات سے ایسے قطعی نتائج نکالے جیسے متن اس کے سامنے موجود ہو۔ مسلم محققین کی تنقید کا پہلا نکتہ یہی ہے کہ جن روایات کو اس نے بنیاد بنایا ان کی سندوں پر خود مسلم علمِ روایت میں بحث موجود ہے اور ان میں شاذ، منقطع اور ضعیف خبریں شامل ہیں، لہٰذا ان سے اتنا بڑا نتیجہ نکالنا علمی احتیاط کے خلاف ہے۔

مصحفِ ابنِ مسعود کے بارے میں جیفری کے دعوے

جیفری کے مطابق ابن مسعود کے مصحف میں سورتوں کی ترتیب عثمانی مصحف سے مختلف تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ان کے مصحف میں بعض سورتوں کی جگہ الگ تھی اور سورتوں کو ان کے اپنے انداز میں مرتب کیا گیا تھا۔ دوسرا بڑا دعویٰ یہ تھا کہ ان کے مصحف میں سورۃ الفاتحہ اور معوذتین یعنی سورۃ الفلق و سورۃ الناس شامل نہیں تھیں۔ جیفری نے اس کا یہ مطلب لیا کہ ابن مسعود ان سورتوں کو قرآن کا حصہ نہیں سمجھتے تھے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ پہلی صدی میں قرآن کے حدود و مشمولات ہی متعین نہیں تھے۔

تیسرا دعویٰ قراءت کے اختلافات کا تھا۔ جیفری کی بنائی ہوئی فہرست میں ابن مسعود سے منسوب بہت سی قراءتیں درج ہیں جن میں بعض جگہ لفظ کی تبدیلی، کہیں ہم معنی لفظ، کہیں اضافی توضیحی عبارت اور کہیں ترکیب کا فرق پایا جاتا ہے۔ جیفری نے ان سب کو اصل متن کے اختلافات کے طور پر پیش کیا اور بعض جگہوں پر یہ تک کہا کہ ان میں سے بعض قراءتیں شاید عثمانی متن سے زیادہ قدیم صورت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ چوتھا نکتہ جیفری نے یہ اٹھایا کہ ابن مسعود نے اپنا مصحف عثمانی کمیٹی کے سپرد کرنے سے ابتدا میں پس و پیش کیا، جسے جیفری نے اس دلیل کے طور پر پیش کیا کہ صحابہ خود عثمانی متن کو واحد معیار ماننے پر متفق نہیں تھے۔ ان چاروں دعووں کا مجموعی حاصل جیفری کے ہاں یہ تھا کہ قرآن کا متن ابتدائی دور میں غیر مستحکم تھا اور عثمانی مصحف اسی غیر استحکام کا حکومتی حل تھا۔

جیفری کے نقطۂ نظر کا علمی و تنقیدی جائزہ

مسلم علماء و محققین نے جیفری کے ان دعووں کا تفصیلی جواب دیا ہے۔ پہلا جواب یہ ہے کہ ابن مسعود کا مصحف ایک ذاتی صحیفہ تھا، قرآن کا کوئی متوازی سرکاری متن نہیں۔ اس زمانے میں کئی صحابہ اپنے ذاتی صحیفے رکھتے تھے جن میں وہ قراءت و تفسیر کی اپنی یادداشتیں درج کرتے تھے۔ ذاتی نوٹ میں کسی سورت کا نہ لکھا ہونا اس کے قرآن نہ ہونے کا ثبوت نہیں بنتا، جس طرح آج کسی حافظ کے ذاتی نوٹ میں کسی سورت کا درج نہ ہونا کچھ ثابت نہیں کرتا۔ فاتحہ کے بارے میں منقول توضیحات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اس لیے نہیں لکھی گئی تھی کہ وہ ہر نماز میں پڑھی جانے کی وجہ سے زبانی یاد ہونا یقینی تھا، اور معوذتین کے بارے میں بعض روایات میں انہیں تعویذ و دعا کے طور پر استعمال

کرنے کا پہلو سامنے آتا ہے، لیکن قطعی بات یہ ہے کہ ان سورتوں کا قرآن ہونا تواتر سے ثابت ہے اور کسی ایک ذاتی صحیفے کی کیفیت تواتر کو متاثر نہیں کر سکتی۔

دوسرا جواب قراءتوں سے متعلق ہے۔ جیفری کی فہرست کی بیشتر قراءتیں یا تو شاذ ہیں جو قراءت کی شرائط پر پوری نہیں اترتیں، یا تفسیری اضافے ہیں جو خود راویوں نے وضاحت کے طور پر پڑھے تھے، نہ کہ متن کے طور پر، یا منسوخ التلاوہ صورتوں سے متعلق ہیں۔ مسلم علمِ قراءات نے پہلے دن سے معیار مقرر کر دیا تھا :جو قراءت عثمانی رسم کے موافق ہو، عربی قواعد کے مطابق ہو اور سنداً متواتر یا صحیح طور پر ثابت ہو وہی قراءت ہے۔ اس معیار کے بغیر ہر منقول لفظی صورت کو متن قرار دینا علمی بددیانتی نہ بھی ہو تو کم از کم طریقۂ کار کی سنگین غلطی ضرور ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنا آخری موقف واضح ہے :انہوں نے عثمانی مصحف کی مخالفت نہیں کی، ان کے شاگردوں کی قراءت عثمانی مصحف ہی سے چلی اور کوفہ کی قراءت کی پوری روایت اسی مصحف پر قائم ہے۔ ابتدائی تحفظات اگر کسی روایت میں ہیں بھی تو وہ ذاتی صحیفے کے ضائع کیے جانے کے جائز پہلو سے متعلق تھے، متن کی صحت کے انکار سے نہیں۔

چوتھا جواب جیفری کے طریقے کے اندرونی تضاد پر ہے۔ وہ ایک طرف تو مسلم روایات کو تاریخی طور پر ناقابلِ اعتماد کہتا ہے، اور دوسری طرف انہی روایات کے سب سے کمزور حصے کو اپنے سب سے بڑے دعوے کی بنیاد بنا لیتا ہے۔ یہ انتخابی رویہ تحقیق نہیں، مفروضے کی تلاش ہے۔ جدید دور میں جب یمن و دیگر مقامات سے پہلی صدی ہجری کے مصاحف و اوراق سامنے آئے تو ان کا متن عثمانی مصحف کے مطابق ہی نکلا اور کسی بڑے متبادل متن کی کوئی شہادت نہیں ملی، جس سے جیفری کے تصور کی بنیاد مزید کمزور ہوئی ہے۔

جدول :جیفری کے دعوے اور ان کا جواب

جیفری کا دعویٰ	علمی جواب
سورتوں کی ترتیب مختلف تھی	ذاتی صحیفے کی ترتیب سرکاری متن کی دلیل نہیں؛ سرکاری ترتیب تواتر و اجماع سے ثابت ہے
فاتحہ و معوذتین شامل نہیں تھیں	ذاتی نوٹ میں عدم تحریر عدمِ قرآنیّت نہیں؛ دونوں کا قرآن

	ہونا متواتر ہے
بہت سی مختلف قراءتیں تھیں	بیشتر شاذ یا تفسیری اضافے ہیں؛ قراءت کی شرائط پر پوری نہیں اترتیں
ابن مسعود نے مصحف دینے میں پس و پیش کیا	یہ ذاتی صحیفے کا معاملہ تھا؛ ان کی و ان کے شاگردوں کی روایت عثمانی مصحف پر قائم رہی

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ جیفری کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مصحفِ ابن مسعود عثمانی متن سے سورتوں کی ترتیب، فاتحہ و معوذتین کی عدم شمولیت اور متعدد قراءتوں کے اعتبار سے مختلف ایک آزاد متن تھا، اور اس سے اس نے ابتدائی قرآن کے غیر مستحکم ہونے کا نتیجہ نکالا۔ اس کے مقابلے میں علمی جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ مصحف ایک ذاتی صحیفہ تھا، اس سے منسوب بیشتر قراءتیں شاذ یا تفسیری ہیں، فاتحہ و معوذتین کا قرآن ہونا تواتر سے ثابت ہے، اور ابن مسعود و ان کے تلامذہ کی روایت عثمانی مصحف ہی پر قائم رہی۔ اس لیے جیفری کا دعویٰ ماخذ کے انتخابی استعمال اور مفروضہ پر مبنی استنتاج کی ایک نمایاں مثال ہے، نہ کہ متنِ قرآن کی تاریخ کی کوئی ثابت شدہ حقیقت۔

سوال نمبر :2 مستشرقین کے اہداف اور محرکات 20) نمبر(

سوال نمبر2 ۔ مستشرقین کے اہداف اور محرکات پر نوٹ تحریر کیجئے۔(20)

تعارف

پہلی مشق میں مستشرقین کے ظاہری تحقیقی و علمی اہداف کا ذکر آیا تھا۔ اس سوال کا موضوع اس سے آگے کا ہے :وہ محرکات اور پس پردہ مقاصد جو اس علمی سرگرمی کو حرکت دیتے رہے۔ محرک سے مراد وہ قوت ہے جو کسی کام کی طرف مائل کرے، چاہے وہ مذہبی جذبہ ہو، سیاسی ضرورت ہو، معاشی مفاد ہو یا خالص علمی تجسس۔ استشراق صدیوں پر محیط اور کئی ملکوں میں پھیلی ہوئی تحریک ہے، اس لیے اس کے محرکات بھی ایک سے زائد ہیں اور مختلف

ادوار و افراد میں ان کا تناسب بدلتا رہا ہے۔ متوازن جائزے کے لیے ضروری ہے کہ تمام بڑے محرکات کو الگ الگ بیان کیا جائے اور یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ ہر مستشرق پر ہر محرک یکساں لاگو نہیں ہوتا۔

ذیل میں چھ بڑے محرکات کا جائزہ لیا جاتا ہے :مذہبی و تبشیری محرک، سیاسی و استعماری محرک، معاشی و تجارتی محرک، تہذیبی برتری و نفسیاتی محرک، داخلی جاتی و پیشہ ورانہ محرک، اور خالص علمی تجسس۔ ان محرکات کی روشنی میں استشراقی تحریروں کو پڑھنے سے ان کے متن کی نوعیت بہتر طور پر سمجھ میں آتی ہے۔

مذہبی و تبشیری محرک

تاریخی طور پر سب سے قدیم اور طاقتور محرک مذہبی تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں اسلام کا مطالعہ اس لیے کیا گیا کہ اس کا رد لکھا جائے اور عیسائی عوام کو اس کے اثرات سے بچایا جائے۔ چرچ اور خانقاہیں اس کام کی سرپرستی کرتی تھیں اور قرآن کے پہلے لاطینی ترجمے کا مقصد بھی یہی تھا۔ بعد کے ادوار میں یہ محرک مشنری تحریک کی صورت میں منظم ہوا۔ انیسویں و بیسویں صدی میں ایسی تنظیمیں اور جریدے سامنے آئے جن کا صریح مقصد مسلمانوں تک عیسائیت کی تبلیغ تھا، اور ان کے زیرِ اہتمام اسلام پر لکھی جانے والی کتابوں کا لہجہ اور نتائج اسی مقصد سے متعین ہوتے تھے۔ زویمر جیسے مشنری مصنفین کی تحریریں اس کی واضح مثال ہیں جن میں علمی مواد تبلیغی مقصد کے تابع تھا۔

اس محرک کا اثر طریقۂ تحقیق پر یہ پڑا کہ قرآن و سیرت کے وہی پہلو منتخب کیے گئے جن پر اعتراض ہو سکتا تھا، انبیاء کی قرآنی تصویر کا بائبلی تصویر سے موازنہ اس انداز میں کیا گیا کہ قرآنی بیان کو ماخوذ یا تبدیل شدہ ثابت کیا جائے، اور احکام و عقائد کی وہ تشریح اختیار کی گئی جو قاری کو اسلام سے دور کرے۔ یہ بات البتہ یاد رہے کہ اس دور کے بعض اہلِ قلم نے براہِ راست مناظرے کے بجائے بظاہر علمی انداز اپنایا، مگر مقصد کی یکسانیت نتائج میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ مسلم محققین نے اسی لیے استشراق کے اس طبقے کو علمی کے بجائے تبشیری ادب قرار دیا ہے۔

سیاسی و استعماری محرک

دوسرا بڑا محرک سیاسی و استعماری تھا۔ جب یورپی طاقتوں نے مسلم دنیا پر قبضہ جمانا شروع کیا تو انہیں مقامی زبانوں، قوانین، قبائل، فرقوں اور نفسیات کو سمجھنے کی انتظامی ضرورت پیش آئی۔ فرانس کے مصر پر حملے کے ساتھ

ماہرین کی ایک پوری جماعت آئی جس نے مصر کی زبان، آثار اور معاشرے کا مبسوط جائزہ تیار کیا۔ برطانوی ہند میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں حکومت نے عربی، فارسی و اردو اور اسلامی قانون کے مطالعے کی سرپرستی اس لیے کی کہ عدالتوں، محصولات اور انتظامی معاملات میں اس سے مدد لی جا سکے۔ ہالینڈ نے انڈونیشیا کے لیے اور روس نے وسطی ایشیا کے لیے اسی نوع کے ماہرین تیار کیے۔

اس محرک کے تحت ہونے والی تحقیق کا ایک بڑا حصہ مقبوضہ معاشروں کی کمزوریوں، ان کے داخلی اختلافات اور ان کی مزاحمت کی نفسیات کو جاننا بھی تھا، تاکہ حکومت کو مستحکم ہو سکے۔ ایڈورڈ سعید نے اپنی مشہور کتاب اورینٹل ازم میں اسی تعلق کو مرکزی حیثیت دی اور کہا کہ مشرق کے بارے میں مغربی علم طاقت کے ڈھانچے سے الگ نہیں رہا۔ اس رائے سے جزوی اختلاف ممکن ہے اور بعض مستشرقین کا استعماری انتظامیہ سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا، لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ اداروں کی مالی سرپرستی اور موضوعات کے انتخاب میں سیاسی ضرورت کا واضح دخل رہا ہے۔

معاشی، تہذیبی اور ادارہ جاتی محرکات

تیسرا محرک معاشی و تجارتی تھا۔ مشرق کے ساتھ تجارت، وہاں کی منڈیوں تک رسائی اور بعد میں تیل و دیگر وسائل کی اہمیت نے اس خطے کے مطالعے کو عملی قدر دی۔ تجارتی کمپنیوں، سفارت خانوں اور ترجمانوں کی ضرورت نے زبان دانوں کی ایک پوری نسل تیار کی جن میں سے کئی آگے چل کر مستشرقین کہلائے۔ اسی طرح میوزیموں اور کتب خانوں کے لیے مخطوطات و نوادرات جمع کرنے کی دوڑ بھی معاشی و ادارہ جاتی مفادات سے جڑی ہوئی تھی، جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں اسلامی مخطوطات یورپ منتقل ہوئے۔

چوتھا محرک تہذیبی برتری کا احساس اور اس کا نفسیاتی پہلو ہے۔ کئی مغربی مصنفین کے ہاں یہ تصور کام کرتا رہا کہ مغرب ترقی و عقل کا مرکز ہے اور مشرق پسماندہ و جامد، لہٰذا مشرق کا مطالعہ اس کی اصلاح یا اس پر تنقید کے حق کے ساتھ کیا گیا۔ پانچواں محرک ادارہ جاتی و پیشہ ورانہ تھا: جامعات کی کرسیاں، ڈگریاں، شہرت، تحقیقی گرانٹس اور تصانیف کی اشاعت، یہ سب ایک محقق کو اس میدان میں آگے بڑھاتے تھے اور موضوع و نتیجے کے انتخاب میں غیر محسوس طور پر اثر انداز ہوتے تھے، خصوصاً جب متنازع نتائج زیادہ توجہ حاصل کرتے ہوں۔ ان محرکات کا ذکر کسی

فرد کی نیت پر حکم لگانے کے لیے نہیں، بلکہ یہ سمجھنے کے لیے ہے کہ علمی پیداوار ہمیشہ ایک ماحول میں ہوتی ہے اور اس ماحول کے اثرات سے بالکل خالی نہیں رہتی۔

خالص علمی تجسس اور متوازن جائزہ

ان تمام محرکات کے ساتھ چھٹا محرک خالص علمی تجسس بھی حقیقت ہے۔ ایسے مستشرقین موجود رہے ہیں جنہوں نے کسی ادارے یا مشن کے بغیر، زبان و ادب کے ذوق میں عمر گزاری اور جن کے کام میں اسلام دشمنی کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ بعض نے مسلمانوں کے ساتھ عرصے تک رہ کر ان کے احوال کو ہمدردی سے بیان کیا اور بعض نے مغرب میں پھیلی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ جدید دور میں جامعات کے اندر سے ہی کلاسیکی استشراق پر تنقید ہوئی ہے اور نئی نسل کے کئی محققین زیادہ محتاط و متوازن انداز اختیار کرتے ہیں۔

متوازن جائزہ یہ ہے کہ اہداف و محرکات کو ایک مرکب کے طور پر دیکھا جائے۔ کسی تحریر کی قدر اس کے مصنف کی نیت گننے سے نہیں، اس کے دلائل و مآخذ کو پرکھنے سے متعین ہوتی ہے۔ یہی رویہ مسلم مفکرین کے بہترین کام میں نظر آتا ہے :انہوں نے نہ ہر مستشرق کو دشمن قرار دیا اور نہ ہر تحریر کو علم مان لیا، بلکہ موضوع وار پرکھ کر جس بات کو دلیل سے ثابت پایا اسے قبول کیا اور جسے بے بنیاد پایا اس کا علمی جواب دیا۔ طالب علم کے لیے یہی اسلوب قابلِ تقلید ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ مستشرقین کے اہداف و محرکات مذہبی و تبشیری جذبے سے لے کر استعماری انتظامی ضرورت، معاشی مفاد، تہذیبی برتری کے احساس، ادارہ جاتی پیشہ ورانہ مفادات اور خالص علمی تجسس تک پھیلے ہوئے ہیں۔ تاریخی ادوار میں پہلے تین محرکات کا غلبہ رہا اور اسی غلبے نے قرآن و اسلام کے بارے میں ان کی تحریروں کے موضوعات، لہجے اور نتائج کو گہرا رنگ دیا۔ ان محرکات کو سمجھنا استشراقی ادب کو پڑھنے کی کنجی ہے، کیونکہ محرک معلوم ہو تو یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ مصنف نے کون سا سوال اٹھایا، کون سا ماخذ منتخب کیا اور کس نتیجے پر پہنچنا اس کے لیے فطری تھا۔

سوال نمبر :3 جمعِ قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات کا مدلل جواب 20) نمبر(

سوال نمبر3 ۔ جمعِ قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات کا مدلل جواب تحریر کیجئے۔(20)

تعارف

جمعِ قرآن وہ باب ہے جس پر مستشرقین نے سب سے زیادہ اعتراضات کیے ہیں، کیونکہ اگر مسلمانوں کو یہ ماننے پر آمادہ کر لیا جائے کہ قرآن کی تدوین غیر یقینی اور متاخر ہے تو اس کی حجیت کی بنیاد ہی متزلزل ہو جائے گی۔ ان اعتراضات کی نوعیت زیادہ تر یہ ہے :قرآن نبی کریم ﷺ کے دور میں کتابی صورت میں جمع نہیں ہوا؛ جمع کا کام دہائیوں بعد سیاسی وجوہ سے ہوا؛ ذاتی مصاحف کی موجودگی بتاتی ہے کہ متن میں اختلاف تھا؛ عثمانی دور میں دوسرے نسخے جلا کر متن کو یکساں بنایا گیا؛ اور بعض آیات کے ضائع ہو جانے کی روایات بھی ملتی ہیں۔ اس جواب میں ہر اعتراض کو الگ الگ لے کر اس کا مدلل رد پیش کیا جائے گا۔

جواب کی بنیادیں تین ہیں۔ اول، تاریخی روایات کی وہ مضبوط و متواتر صورت جو خود مسلم مآخذ میں محفوظ ہے۔ دوم، مادی شواہد، یعنی پہلی صدی ہجری کے مصاحف و اوراق جو آج بھی موجود ہیں۔ سوم، طریقۂ کار کا اصول کہ کسی شاذ یا ضعیف خبر کو متواتر حقیقت پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ انہی بنیادوں پر اعتراضات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

اعتراض اوّل :قرآن عہدِ نبوی میں نہ لکھا گیا؛ اور اس کا جواب

پہلا اعتراض یہ ہے کہ قرآن آپ ﷺ کی حیات میں تحریری صورت میں مکمل نہیں ہوا تھا اور مسلمان صرف زبانی یادداشت پر انحصار کرتے تھے، اس لیے اس میں کمی بیشی کا امکان موجود تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کاتبینِ وحی کا باقاعدہ نظام، آپ ﷺ کی یہ ہدایت کہ ہر آیت کو اس کی سورت میں مقررہ جگہ رکھا جائے، اور مختلف صحابہ کے پاس لکھے ہوئے صحیفوں کی موجودگی، یہ سب اس بات کے قطعی ثبوت ہیں کہ وحی نزول کے ساتھ لکھی جاتی تھی۔ دورِ نبوت میں ایک جلد میں نہ ہونا اور لکھا ہی نہ جانا بالکل الگ باتیں ہیں۔ اس دور کی کتابت کی مادی صورت چمڑے و دیگر مواد پر منتشر ہو سکتی تھی، مگر متن تحریر میں موجود تھا۔

دوسری طرف زبانی روایت کو کمزور سمجھنا بھی عرب معاشرے سے ناواقفیت ہے۔ وہ قوم جو ہزاروں اشعار و انساب کو سینوں میں محفوظ رکھتی تھی، اس کے سینکڑوں افراد کا پورے قرآن کو آنسو بہا دینے والی تلاوت و نماز کی روزانہ مشق کے ساتھ یاد رکھنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ حفظ اور کتابت ایک دوسرے کی تصدیق کرتے تھے :لکھا ہوا اس وقت قبول ہوتا جب حافظ بھی اس کی تائید کرے، اور یہ دوہرا نظام کسی ایک فرد کی غلطی کے امکان کو تقریباً ختم کر دیتا تھا۔ عثمانی کمیٹی کے سربراہ خود زید بن ثابت تھے جو کاتبِ وحی بھی تھے اور حافظ بھی۔ اس لیے تاخیر کا اعتراض حقیقت کے بجائے فرضی شبے پر مبنی ہے۔

اعتراض دوم و سوم :جمعِ صدیقی کی ضرورت اور ذاتی مصاحف؛ اور ان کے جوابات

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر قرآن محفوظ تھا تو جنگِ یمامہ کے بعد جمع کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور حضرت عمر کو حضرت ابوبکر کو قائل کیوں کرنا پڑا۔ جواب یہ ہے کہ ضرورت متن کے ضیاع کی وجہ سے نہیں، اس احتیاط کی وجہ سے پیش آئی کہ منتشر صحیفوں اور حافظوں پر مبنی نظام کو ایک سرکاری مرتب صورت دے دی جائے۔ حضرت ابوبکر کا ابتدائی تردد اس کام کی ذمہ داری و احتیاط کی وجہ سے تھا، نہ کہ شک کی وجہ سے، اور جب کمیٹی بنی تو اس نے یہ شرط رکھ کر کام کیا کہ ہر آیت لکھی ہوئی صورت میں دو گواہوں کے ساتھ لائی جائے۔ یہ طریقہ متن کی تصدیق کا سخت ترین معیار تھا، کمزوری کی دلیل نہیں۔

تیسرا اعتراض ذاتی مصاحف کا ہے کہ ابن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے مصاحف میں موجودہ متن سے فرق تھا، اس لیے اصل میں کئی قرآن تھے۔ اس کا مدلل جواب پہلی مشق و اس مشق کے پہلے سوال میں گزر چکا ہے کہ یہ صحیفے ذاتی استعمال کے تھے جن میں تفسیری حواشی، دعائیں اور وقتی قراءتیں شامل تھیں؛ ان کے حامل خود عثمانی مصحف پر متفق ہوئے اور ان سے چلنے والی کوئی الگ امت یا الگ متن تاریخ میں کبھی موجود نہیں رہا۔ اگر واقعی متعدد متون ہوتے تو امت کے مختلف خطوں میں آج الگ الگ قرآن پائے جاتے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ہر حصے میں، ہر فرقے کے پاس، ایک ہی متن ملتا ہے۔ یہ عملی حقیقت اکیلی ہی اس اعتراض کا کافی جواب ہے۔

جدول :اعتراض اور اس کا جواب مختصراً

اعتراض	جواب
عہدِ نبوی میں کتابی جمع نہ ہوا	کتابتِ وحی کا باقاعدہ نظام موجود تھا؛ جلد کا نہ ہونا لکھے نہ جانے کے برابر نہیں
ذاتی مصاحف میں اختلاف تھا	وہ تفسیری نوٹ والے ذاتی صحیفے تھے؛ ان کے حامل بھی عثمانی مصحف پر متفق ہوئے
نسخے جلائے گئے	اجماعِ صحابہ سے، اختلاف کی روک تھام کے لیے؛ متن صدیقی مصحف ہی کا رہا
بعض آیات ضائع ہو گئیں	مذکورہ خبریں منسوخ التلاوۃ یا ضعیف ہیں؛ قرآن تواتر سے ثابت ہوتا ہے

اعتراض چہارم و پنجم :نسخوں کا جلایا جانا اور ضائع شدہ آیات کی روایات؛ اور ان کے جوابات

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دوسرے نسخے جلوا کر اپنی پسند کا متن نافذ کیا، جسے سیاسی جبر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ عمل کمیٹی و مشاورت اور صحابہ کے اجماع سے ہوا، اس میں وہی متن رکھا گیا جو صدیقی مصحف میں تھا اور اس کی بنیاد عرضۂ اخیرہ تھی۔ جلائے جانے والے مواد میں ذاتی صحیفے اور مقامی تحریریں تھیں جن کے متون میں کوئی الگ وحی شامل نہیں تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سمیت اکابر صحابہ نے اس فیصلے کی تائید کی۔ اگر یہ جبر ہوتا تو اس دور کے آزاد مزاج معاشرے میں اس پر وہ وسیع مخالفت اٹھتی جس کا تاریخ میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ دنیا کی جن قوموں نے اپنی مقدس کتب کے متن کو اس طرح متحد کرنے کا اہتمام نہیں کیا، ان کے ہاں متن کی جو صورت بنی، تورات و انجیل کی مثال سامنے ہے۔

پانچواں اعتراض بعض منفرد روایات کو لے کر کیا جاتا ہے جن میں کسی آیت یا سورت کے رہ جانے کا ذکر ہے۔ ان روایات کا علمی درجہ دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو منسوخ التلاوۃ آیات سے متعلق ہیں، یعنی وہ حصے جن کی تلاوت اللہ کے حکم سے ختم کر دی گئی تھی مگر ان کا مضمون امت کو معلوم تھا، یا ذاتی صحیفوں کے اندراج و اخراج سے متعلق وقتی واقعات ہیں، یا ضعیف سندوں کی خبریں ہیں۔ مسلم اصول یہ ہے کہ قرآن صرف تواتر سے ثابت ہوتا ہے؛ جو

تواتر سے ثابت ہے وہ قرآن ہے اور جو اس درجے کو نہیں پہنچتا وہ چاہے کسی کتاب میں منقول ہو، قرآن کے متن میں کمی بیشی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس کے برعکس قدیم ترین مصاحف کی مادی شہادت دیکھی جائے تو برمنگھم و صنعاء کے اوراق اور پہلی صدی کے دیگر مصاحف کا متن، چند رسمی و املا کے فروق کے سوا، آج کے مصحف کے عین مطابق ہے۔ یہ شہادت اعتراضات کے اس پورے ڈھانچے کو کمزور کر دیتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ جمعِ قرآن پر کیے گئے اعتراضات کا مدلل جواب پانچ نکات میں سمٹتا ہے :قرآن عہدِ نبوی میں باقاعدہ لکھا گیا اور اس کی ترتیب متعین ہوئی؛ جمعِ صدیقی تصدیق کے سخت ترین معیار سے ہوا اور اس کی ضرورت انتظامی احتیاط تھی، شبہ نہیں؛ ذاتی مصاحف تفسیری یادداشتوں پر مشتمل ذاتی صحیفے تھے، متوازی قرآن نہیں؛ عثمانی توحیدِ مصحف اجماعِ صحابہ سے ہوا اور اس میں متن وہی رکھا گیا جو عرضۂ اخیرہ میں ثابت تھا؛ اور منسوخ التلاوۃ یا ضعیف روایات کو تواتر کے مقابلے میں کھڑا کرنا علمی اصولوں کے خلاف ہے۔ اس کے اوپر بڑی صدی کے موجود مصاحف کی شہادت اور پوری دنیا میں ایک ہی متن کی موجودگی اس حقیقت کی عملی تصدیق ہیں کہ قرآن مجید آج اسی صورت میں موجود ہے جس صورت میں وہ نازل ہوا تھا۔

سوال نمبر :4 نسخ پر مستشرقین کے اعتراضات کا علمی و تنقیدی جائزہ 20) نمبر(

سوال نمبر4 ۔ نسخ پر مستشرقین کے اعتراضات کا علمی و تنقیدی جائزہ پیش کیجئے۔(20)

تعارف

نسخ کا لغوی معنی مٹانا، ہٹانا یا نقل کرنا ہے اور اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ شریعت کے کسی حکم کو، جو ایک مدت تک نافذ رہا ہو، بعد کی وحی کے ذریعے ختم کر کے اس کی جگہ نیا حکم دے دیا جائے۔ یہ قرآن و سنت کے مطالعے کا ایک اہم باب ہے جس پر مسلم علماء نے مستقل کتب لکھی ہیں۔ مستشرقین نے اس باب کو قرآن کے بارے میں اپنے

عمومی زاویۂ نگاہ کے تحت خاص تنقید کا نشانہ بنایا اور اس سے کئی دور رس نتائج نکالنے کی کوشش کی۔ اس سوال میں ان اعتراضات کو پیش کر کے ان کا علمی و تنقیدی جائزہ مقصود ہے۔

اعتراضات کی بنیادی شکلیں یہ ہیں :نسخ وحی میں تضاد کی دلیل ہے؛ اس سے معاذ اللہ یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کا ارادہ بدل گیا؛ نسخ کی موجودگی بتاتی ہے کہ قرآن پر انسانی تدوین کا عمل جاری رہا؛ منسوخ آیات کی بڑی تعداد خود ناسخ و منسوخ کی پہچان کو غیر یقینی بناتی ہے؛ اور بعض مستشرقین، خصوصاً جان برٹن، نے تو یہ نظریہ پیش کیا کہ نسخ کا تصور بعد کے فقہاء کی ایجاد ہے جس سے اصولی مشکلات حل کی گئیں۔ ان ایک ایک اعتراض کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

نسخ کی حقیقت، اقسام اور حکمت

اعتراضات سمجھنے سے پہلے نسخ کی حقیقت واضح ہونا ضروری ہے۔ علماء نے نسخ کی تین اقسام بیان کی ہیں :کسی حکم کا قانوناً ختم ہونا جبکہ آیت کی تلاوت باقی رہے، یہ سب سے معروف قسم ہے اور اس کی مثالیں کم و بیش متفق علیہ ہیں۔ دوسری قسم میں حکم باقی رہتا ہے مگر مخصوص صورت میں تلاوت منسوخ ہوتی ہے جسے منسوخ التلاوۃ کہا جاتا ہے۔ تیسری قسم میں تلاوت و حکم دونوں منسوخ قرار پاتے ہیں۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ ہر ظاہری تبدیلی نسخ نہیں ہوتی؛ تخصیص، تقیید، بیان اور تدریجی حکم کو مسلم علماء نے نسخ سے الگ رکھا ہے اور بعد کے محققین نے بہت سی مثالوں کو نسخ کے دائرے سے نکال کر انہی ابواب میں رکھا ہے۔

نسخ کی حکمت اس تدریج میں ہے جس سے شریعت نے ایک جاہلی معاشرے کو مرحلہ وار بدلا۔ شراب کی حرمت تین تدریجی مراحل میں آئی، قبلہ کی تبدیلی سے امت کی سمت و وحدت کا امتحان بھی ہوا اور تشخص بھی، عدت و میراث کے احکام معاشرتی ضروریات کے ساتھ نازل ہوئے۔ جس طرح ایک معالج مریض کی حالت دیکھ کر دوا بدلتا ہے اور اسے تضاد نہیں کہا جاتا، اسی طرح حکیم شارع کا تدریجی قانون اس کی حکمت کی دلیل ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ نسخ صرف نبوی دور میں ممکن تھا، وحی کے خاتمے کے ساتھ یہ باب بند ہو گیا، اس لیے اس سے متن میں جاری انسانی مداخلت کا کوئی راستہ نہیں کھلتا۔

اعتراضات :تضاد، تبدیلیِ ارادہ اور تدوین کا دعویٰ

پہلا اعتراض یہ ہے کہ نسخ تضاد ہے، ایک کتاب میں ایک حکم آ کر ختم ہو جائے تو اس کی داخلی ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تضاد اسے کہتے ہیں جب ایک ہی وقت میں دو متضاد احکام ایک ہی صورت پر نافذ ہوں۔ نسخ میں زمانی ترتیب واضح ہوتی ہے :پہلا حکم اپنے وقت کے لیے تھا، اس کی مدت ختم ہوئی تو دوسرا حکم آیا۔ دنیا کے ہر قانونی نظام میں قوانین منسوخ و تبدیل ہوتے ہیں اور انہیں نظام کی کمزوری نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کی زندگی و ارتقا کی علامت مانا جاتا ہے۔ خود تورات و انجیل میں بھی پچھلے احکام کی تبدیلی کی مثالیں موجود ہیں، اور عیسائی الہیات میں نئے عہد کا پرانے عہد کے بعض احکام کو ساقط کر دینا معروف تصور ہے۔ اس لیے جو اصول اپنے ہاں تسلیم ہو اسے قرآن کے لیے تضاد قرار دینا دوہرا معیار ہے۔

دوسرا اعتراض بداء کا ہے یعنی یہ کہ نسخ سے لازم آتا ہے کہ پہلے ارادہ کچھ تھا اور بعد میں بدل گیا۔ مسلم علماء نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم و ارادہ ازلی ہے؛ نسخ کا ہر مرحلہ اس کے علم میں پہلے سے تھا۔ تبدیلی حکم کے ظہور میں ہوئی ہے، علمِ الٰہی میں نہیں۔ سورۃ البقرہ کی آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ جب کوئی آیت منسوخ کی جاتی ہے تو اس سے بہتر یا اس جیسی لائی جاتی ہے، اور ساتھ یہ اعلان بھی ہے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ نسخ قرآنی متن پر انسانی تدوین کی دلیل ہے۔ جواب یہ ہے کہ نسخ کا اختیار امت یا کسی مرتب کو نہیں تھا، یہ صرف نزول کے دور میں شارع کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی شہادت بھی متواتر نص سے ثابت ہوتی تھی۔ جان برٹن کے اس نظریے پر کہ نسخ فقہاء کی ایجاد ہے، خود مغربی و مسلم محققین نے تنقید کی ہے کہ یہ نظریہ متقدم متون کے واضح بیانات کو نظر انداز کر کے بنایا گیا ہے اور اس کے ثبوت کے لیے وہی انتخابی ماخذ گیری استعمال کی گئی ہے جو اس مکتب کی پہچان ہے۔

منسوخ آیات کی تعداد پر اعتراض اور اس کا تنقیدی جائزہ

چوتھا اعتراض یہ اٹھایا جاتا ہے کہ منسوخ آیات کی تعداد میں علماء کا سخت اختلاف ہے، کسی نے سیکڑوں کہیں تو کسی نے بہت کم، لہٰذا یہ باب غیر یقینی ہے۔ تاریخی جائزہ اس کے برعکس ایک حوصلہ افزا تصویر دیتا ہے :ابتدائی کتب میں نسخ کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا تھا جس میں تخصیص و تقیید بھی شامل تھی، اس لیے تعداد بڑی

معلوم ہوئی۔ بعد کے محققین نے اصطلاح کو دقیق کیا تو تعداد خود بخود گھٹتی گئی، حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ نے صرف پانچ آیات کو حقیقی نسخ کے دائرے میں رکھا۔ علم کا یہ ارتقائی تضیق اس کی کمزوری نہیں، اس کی تنقیح ہے۔ مستشرقین کا اس مقام پر طریقہ یہ رہا کہ تعداد کے سب سے بڑے قائل کا قول لے لیا اور اسی کو اسلام کا موقف بنا کر پیش کیا، حالانکہ علمی دیانت یہ تھی کہ اس باب کے پورے ارتقائی جائزے کو سامنے رکھا جاتا۔

تنقیدی جائزے کا خلاصہ چند اصولوں میں سمٹتا ہے۔ اول، مستشرقین نے نسخ کو اس کے شرعی ضوابط سے الگ کر کے ایک عام لغوی خیال کے طور پر لیا۔ دوم، انہوں نے نسخ کو ان کتابوں کے متن کی تاریخ پر قیاس کیا جن کی تدوین صدیوں چلی، جبکہ قرآن میں نسخ وحی کے دور تک محدود تھا اور اس کے بعد بند ہے۔ سوم، انہوں نے نسخ کی حکمت و تدریج کے پہلو کو تقریباً نظر انداز کیا، حالانکہ کسی حکم کی سماجی تبدیلی میں تدریج انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ چہارم، جہاں خود مسلم علماء نے اختلاف کیا اسے انہوں نے متن کے خلاف دلیل بنایا، حالانکہ کسی متن کی تفہیم میں اہلِ علم کے اختلاف اور متن کے اختلاف میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں نسخ پر اعتراضات علمی سے زیادہ زاویۂ نگاہ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ نسخ شریعت کا ایک ثابت شدہ، ضوابط کا پابند اور حکمت پر مبنی باب ہے جس کا دور وحی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس پر مستشرقین کے اعتراضات، خواہ وہ تضاد کا ہو، بداء کا ہو، انسانی تدوین کا ہو یا تعداد کے اختلاف کا، سب کا مفصل جواب مسلم علم میں موجود ہے اور ان میں سے کئی اعتراضات دوہرے معیار اور قیاسِ مع الفارق پر مبنی ہیں۔ منسوخ مثالوں کی تعداد کے بارے میں مسلم تحقیق کی اپنی تاریخ دکھاتی ہے کہ یہ باب تضیق و تنقیح کی طرف گیا ہے، بے ضابطگی کی طرف نہیں۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ نسخ کو اس کے اصولی ضوابط کے ساتھ سمجھے اور اعتراضات کو ان کے اصل درجے میں رکھ کر پرکھے۔ یہی علمی و تنقیدی رویہ اس سوال کا حاصل ہے۔

سوال نمبر :5 غیر معیاری مآخذ کے بارے میں مستشرقین کے اعتراضات 20) نمبر(

سوال نمبر5 ۔ غیر معیاری مآخذ کے بارے میں مستشرقین کے اعتراضات پر نوٹ تحریر کیجئے۔(20)

تعارف

غیر معیاری مآخذ سے مراد وہ خبریں، روایات اور کتابیں ہیں جو کسی علم کے مقررہ اصولوں کے مطابق قابلِ اعتماد درجے کو نہیں پہنچتیں۔ جمعِ قرآن، قراءات اور تاریخِ متن کے مباحث میں یہ اصطلاح دو طرفہ استعمال ہوتی ہے اور اسی لیے یہ سوال اہم ہے۔ ایک طرف مستشرقین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کی تاریخ جن اسلامی مآخذ پر مبنی ہے وہ دیر سے مرتب ہوئے ہیں اور ان کی روایات معیاری نہیں ہیں، لہٰذا ان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف مسلم محققین کا جوابی اعتراض یہ ہے کہ خود مستشرقین نے قرآن کے خلاف اپنے بڑے دعوے غیر معیاری مآخذ، یعنی ضعیف، شاذ اور منقطع روایات اور غیر موثق کتابوں سے اخذ کیے ہیں۔ اس نرٹ میں دونوں رخوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

اس بحث کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ تاریخ کا ہر علم مآخذ پر منحصر ہوتا ہے۔ ماخذ کا درجہ متعین کیے بغیر نہ قبول درست ہے نہ رد۔ مسلم روایت نے اس مسئلے کا حل صدیوں پہلے علم الجرح والتعدیل، سند کی جانچ اور تواتر کے تصور کی صورت میں پیش کر دیا تھا۔ مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ انہی اصولوں کی روشنی میں لیا جائے گا اور ساتھ یہ بھی دکھایا جائے گا کہ ان کے اپنے استعمال کردہ مآخذ اس جانچ پر کہاں کھڑے ہوتے ہیں۔

مستشرقین کا اعتراض :اسلامی مآخذ متاخر اور غیر معیاری ہیں

مستشرقین کا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ جمعِ قرآن اور سیرت کے بارے میں تفصیلی معلومات ان کتابوں میں ملتی ہیں جو واقعات کے ایک دو صدی بعد لکھی گئیں، اس لیے ان کی خبریں قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتیں۔ گولڈزیہر نے حدیث کی روایت کو دوسری صدی کی فکری کشمکش کا عکس قرار دیا اور شاخت نے اسناد کو پچھلی طرف بڑھایا جانے والا سلسلہ کہا۔ اسی انداز میں کتاب المصاحف اور فضائل کی کتب کی روایات کو بھی مشکوک کہا گیا۔ اس اعتراض کا منطقی نتیجہ یہ بنایا گیا کہ قرآن کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں جو کچھ مسلمان کہتے ہیں وہ بعد کی تعمیر ہے اور اصل حقائق نامعلوم ہیں۔

اس اعتراض کا پہلا جواب یہ ہے کہ تدوینِ کتب کا متاخر ہونا روایت کے متاخر ہونے کے مترادف نہیں۔ مسلم معاشرے میں علم کا اصل نظام سند سے منسلک زبانی روایت تھا، جس میں ہر خبر اپنے سلسلۂ رواۃ کے ساتھ منتقل ہوتی تھی، اور کتب میں تدوین اسی زندہ روایت کی تحریری صورت تھی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ مسلم محدثین نے ان مآخذ کو اندھا

دھند معیاری نہیں مانا؛ انہوں نے راویوں کے حالات، ان کی عدالت و ضبط، سند کے اتصال اور متن کی مخالفت و موافقت کی بنیاد پر درجہ بندی کی اور ضعیف کو ضعیف کہہ کر الگ کر دیا۔ یہ تنقیدی نظام اس دور سے صدیوں پہلے کا ہے جب مغرب میں تاریخی تنقید نے قدم رکھا۔ تیسرا جواب مادی شواہد کا ہے :پہلی صدی کے مصاحف و اوراق ان کتابوں کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں، اس لیے متاخر تدوین کا اعتراض مادی ثبوت کے سامنے کمزور ہو جاتا ہے۔

مسلم محققین کا جوابی اعتراض :مستشرقین کا غیر معیاری مآخذ پر انحصار

اب دوسرا رخ دیکھئے۔ مسلم محققین کہتے ہیں کہ مستشرقین نے قرآن کے بارے میں اپنے متنازع نتائج زیادہ تر انہی غیر معیاری مآخذ سے نکالے ہیں۔ اس کی اقسام یہ ہیں :ضعیف و موضوع روایات جنہیں خود مسلمان محدثین رد کر چکے تھے؛ شاذ قراءتیں جو قراءت کی شرائط پر پوری نہیں اترتیں؛ کتاب المصاحف وغیرہ کی منقطع و مرسل خبریں؛ سیرت و مغازی کی وہ روایات جن کے بارے میں خود ان کے مؤلفین نے بھی سند کا اہتمام نہیں کیا تھا؛ اسرائیلیات و قصص کا مواد؛ اور مخالف یا گمنام فرقوں کی جدلی کتابیں۔ ان میں سے ہر قسم کے ماخذ کو اس کے درجے سے اوپر اٹھا کر دلیل بنانا طریقۂ تحقیق کی بنیادی غلطی ہے۔

اس انحصار کی مثالیں پچھلے سوالات میں آ چکی ہیں :جیفری نے مصاحفِ صحابہ کے بارے میں ادبی کتابوں کی منفرد خبروں کو موجود متن کے متوازی متن کی بنیاد بنا لیا؛ نسخ کی بحث میں سب سے بڑی تعداد والے اقوال کو منتخب کیا گیا؛ اور تاریخِ قرآن میں واقدی جیسے ان مؤلفین کی روایات کو اس وقت قبول کیا گیا جب وہ مفروضے کے موافق تھیں اور وہیں معتبر روایات کو بعد کی اختراع کہا گیا۔ یہ رویہ اس اصول کے خلاف ہے کہ دلیل کا وزن ماخذ کے وزن کے برابر ہوتا ہے۔ جب ماخذ غیر معیاری ہو تو اس پر قائم عمارت بھی اسی درجے کی ہو گی، خواہ اس کی زبان کتنی ہی علمی کیوں نہ ہو۔

معیاری ماخذ کی پہچان اور مستشرقین کے دوہرے معیار کا جائزہ

معیاری ماخذ کی پہچان کے لیے مسلم اصول واضح ہیں :خبر کا سلسلہ متصل ہو، راوی عادل و ضابط ہوں، متن کسی اقوی دلیل کے مخالف نہ ہو، اور قرآن جیسے قطعی مسئلے میں خبر تواتر کے درجے تک پہنچی ہو۔ اس کے علاوہ مادی

نسخے، اجماع اور عملی تواتر اس جانچ کی تائید کرتے ہیں۔ ان اصولوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو جمعِ قرآن کی بنیادی روایت معیاری ترین درجے پر ہے، کیونکہ یہ تواتر، اجماع اور موجود قدیم مصاحف تینوں سے ثابت ہے۔ اس کے مقابلے میں مخالف دعوے جن خبروں پر کھڑے ہیں وہ اس درجے کے قریب بھی نہیں پہنچتیں۔

یہیں پر دوہرے معیار کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔ بائیبل کے مطالعے میں مستشرقین و مغربی محققین دیر سے مرتب انجیلی روایات، غیر معلوم مصنفین اور نسخوں کے اختلافات کے باوجود ان متون کی بنیادی تاریخی قدر کو برقرار رکھتے ہیں اور انہی کے تجزیے سے نتائج نکالتے ہیں۔ لیکن قرآن کے معاملے میں، جہاں سند، حفظ اور تواتر کا نظام کہیں مضبوط ہے، وہی محققین شک کا وہ معیار لاگو کرتے ہیں جس سے کوئی قدیم متن باقی نہ بچ سکے۔ اسی طرح اسلامی مآخذ کو جب وہ ان کے موافق ہوں تو دلیل اور جب مخالف ہوں تو احتراع کہہ دینا بھی اسی دوہرے معیار کی صورت ہے۔ مستند تنقید یہ ہے کہ معیار ایک ہو اور دونوں طرف یکساں لاگو ہو۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ غیر معیاری مآخذ کے بارے میں بحث دو طرفہ ہے۔ مستشرقین کا اسلامی مآخذ کو متاخر و غیر معیاری کہنے کا اعتراض اس لیے قائم نہیں رہتا کہ مسلم روایت کے پاس سند و جرح و تعدیل کا قدیم تنقیدی نظام، تواتر کی قطعی صورت اور پہلی صدی کے مصاحف کی مادی شہادت موجود ہیں۔ دوسری طرف مسلم محققین کا یہ جوابی اعتراض وزنی ہے کہ مستشرقین کے متنازع دعوے اکثر ضعیف، شاذ و منقطع خبروں اور غیر موثق کتابوں یعنی غیر معیاری مآخذ ہی سے لیے گئے ہیں اور انہیں ان کے درجے سے بڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ طالب علم کے لیے عملی سبق یہ ہے کہ وہ کسی بھی خبر کو قبول کرنے سے پہلے اس کے ماخذ کا درجہ معلوم کرے؛ یہی ایک عادت اسے استشراقی مباحث میں درست نتیجے تک پہنچائے گی۔